

قرضوں کی اشاریہ بندی۔ شرعی نقطہ نظر

محمد طاہر منصورى ☆

فکرو نظر کے گذشتہ تین شماروں میں شاہ محی الدین ہاشمی صاحب کے استحکام قدر زر اور اشاریہ بندی سے متعلق تین مقالات طبع ہوئے۔ اسی موضوع سے متعلق جناب طاہر منصورى صاحب کا زیر نظر مقالہ ہمیں موصول ہوا، جس میں شاہ صاحب محترم کے نتائج تحقیق سے اختلاف کیا گیا ہے۔

(مدیر)

افراط زر اور اس کے نتیجہ میں سرمایہ کو پہنچنے والے نقصان کا مسئلہ معاصر معیشت کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ غیر مستحکم قیمتوں کا نظام معیشت معاشرے کے تقریباً تمام ہی طبقات کو متاثر کرتا ہے۔ محدود آمدن والے افراد خاص طور پر اس کا نشانہ بنتے ہیں۔ طویل المیعاد مالی معاہدات اور موجد ادائیگیوں پر بھی اس کے منفی اثرات پڑتے ہیں۔ جدید ماہرین معیشت کے ایک حلقہ نے اس مشکل کا حل اشاریہ بندی میں ڈھونڈا ہے۔ لیکن مسلمان علماء اور ماہرین معیشت کی ایک معتدبہ اکثریت نے قرضوں اور موجد ادائیگیوں کی اشاریہ بندی کو قبول نہیں کیا اور شرعی بنیادوں پر اسے شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مذکورہ تجویز ان حلقوں میں خوب سراہی گئی ہے جو بینک کے سود کو جائز دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ انہیں اشاریہ بندی کی صورت میں سود کے جواز کیلئے ایک نئی دلیل ہاتھ آگئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بینک اپنے کھاتہ دار کو اصل زر پر جو اضافہ دیتا ہے وہ سود نہیں بلکہ اس نقصان کی تلافی ہے جو افراط زر کی وجہ سے اس کے سرمایہ کو پہنچا ہے۔

☆ بیچر، شریعہ نیکیٹی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

اسی موضوع کے حوالہ سے "فکر و نظر" کے گذشتہ تین شماروں میں جناب شاہ محی الدین صاحب کے نہایت اہم اور فکر انگیز تحقیقی مقالات شائع ہوئے ہیں۔ انہوں نے ایک درست مسئلہ کی نشاندہی کی ہے۔ تاہم ان کے مقالات میں اٹھائے گئے بہت سے نکات قرض کے لین دین کے بارے میں شریعت کی تعلیمات اور اس مسئلہ پر پائے جانے والے امت مسلمہ کے اجماع اور تعامل کے خلاف ہیں۔ قرضوں کی اشاریہ بندی سے متعلق ان کا نقطہ نظر جہاں مسلم معاشرے کے افراد کے باہمی تعلقات کی اخلاقی و روحانی اساس کی نفی کرتا ہے وہاں ان کوششوں سے بھی متصادم ہے جو ملک میں غیر سودی نظام معیشت کے نفاذ کیلئے کی جارہی ہیں۔

اس پس منظر میں یہ ضروری ہے کہ ان کے موقف کا شرعی اصولوں کی روشنی میں جائزہ لیا جائے۔ نیز یہ بھی دیکھا جائے کہ اشاریہ بندی اقتصادی لحاظ سے کس حد تک قابل عمل ہے اور کہاں تک "قرین انصاف" اور "مقتضائے شرع" ہے۔

ان کے مقالات میں اٹھائے گئے نکات مختصراً درج ذیل ہیں۔

- ۱- کانغذی نوٹ حقیقی زر نہیں کیونکہ ان کی حقیقی قدر (Real Value) کوئی نہیں ہوتی۔
 - ۲- کانغذی نوٹ افراط زر کا باعث ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں سرمائے کی قیمت میں کمی واقع ہوتی ہے۔
 - ۳- دائن کے سرمایہ میں کمی کی تلافی مقروض کی شرعی و اخلاقی ذمہ داری ہے۔
 - ۴- زر کی قدر کے تغیر و بے ثباتی کے پیش نظر قرضوں کی واپسی میں "عددی مثلیت" کی بجائے روپے کی بازاری قدر (Market Value) یا اس کی قوت خرید کا لحاظ رکھا جانا چاہئے۔
 - ۵- قرضوں کی اشاریہ بندی روپے کی قوت خرید میں کمی کا ایک منصفانہ حل ہے اور شرعی اصولوں کے مطابق ہے۔
 - ۶- فقہاء احناف فلوس کی ارزانی و گرانی کی حالتوں میں مثلیت کی بجائے ان کی قیمت یا بازاری قدر کے حامی ہیں۔
 - ۷- ربا کی حرمت علت کے ساتھ منسلک ہے اور وہ ظلم ہے۔
- کیا کانغذی نوٹ حقیقی زر نہیں؟

فاضل مقالہ نگار نے اپنے مقالات میں بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ کانغذی زر حقیقی

زر نہیں۔ وہ کاغذی نوٹوں کی شرعی حیثیت کے بارے میں فقہ اکیڈمی کی اس قرار داد کو غلو اور افراط سے تعبیر کرتے ہیں جس میں کاغذی نوٹوں کو شرعی احکام کے اعتبار سے درہم و دینار کے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔ ان کی یہ بات کئی اعتبار سے خلاف حقیقت ہے۔

۱۔ فقہ کی قدیم و جدید کتب میں کیس بھی ثمن یا نقدی کو سونے و چاندی کے ساتھ مخصوص نہیں کیا گیا۔ بلاذری کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور میں اونٹوں کی کھال سے درہم بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس پر ان سے کہا گیا کہ اس طرح تو اونٹ ہی ختم ہو جائیں گے۔ یہ سن کر آپ نے ارادہ ترک کر دیا (۱)۔

امام مالک "المدونة الکبریٰ" میں فرماتے ہیں:

ولو ان الناس اجازوا بينهم الجلود حتى يكون لها سكة وعین لكرهتها ان تباع بالذهب والورق نظرة۔ "اگر لوگ چمڑے کو زر کے طور پر اختیار کر دیں تو میں اس چمڑے کو سونے و چاندی کے بدلے ادھار پر فروخت کو ناجائز سمجھتا ہوں" (۲)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر چمڑہ کی کرنسی بن جائے تو اس میں بھی ربا اور صرف کے وہی احکام جاری ہوں گے جو درہم و دینار میں ہوتے ہیں۔ اس عبارت سے ضمناً اس بات کی بھی نشاندہی ہوتی ہے کہ "حکومت چمڑہ یا کسی بھی دوسری چیز کو کرنسی کے طور پر اختیار کر سکتی ہے۔

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ "درہم و دینار میں "ثمنیت" کا علت ربا ہونا ایک مناسب و درست علت ہے کیونکہ ثمن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اموال کی قیمت و مقدار جانچنے کا ایک معیار ہو۔ خود اس کی ذات سے انشاع مقصود نہیں ہوتا"۔ (۳)

ادارات البحوث العلمیۃ والافتاء کے ایک فتویٰ میں آپ کا ایک اور قول یوں نقل کیا گیا ہے: "درہم و دینار کی اپنی ذاتی اور شرعی کوئی حیثیت نہیں۔ ان کا ثمن ہونا دراصل عرف و عادت کی وجہ سے ہے۔ درہم و دینار اپنی ذات میں مقصود و مطلوب نہیں بلکہ لوگوں کے مالی معاملات کیلئے یہ ایک معیار ہیں۔ اس طرح یہ محض ایک وسیلہ ہیں اور وسیلہ اپنی ذات میں مقصود و مطلوب نہیں ہوتا"۔ (۴)

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام ابن تیمیہ کے نزدیک سونا و چاندی کسی مترک و مقدس کرنسی کی حیثیت نہیں رکھتے کہ ان سے انحراف کرنا جائز نہ ہو بلکہ ان کی نگاہ میں اشیاء کو

جانچنے کیلئے کسی بھی چیز کو معیار بنایا جاسکتا ہے بشرطیکہ عرف عام میں اسے قبولیت حاصل ہو۔
معاصر علماء نے رائج کرنسی کو مکمل طور پر درہم و دینار کے مشابہہ قرار دیا ہے۔ علامہ
یوسف القرضاوی اپنی شہرہ آفاق تصنیف فقہ الزکوٰۃ میں لکھتے ہیں:

"صورت حال یہ ہے کہ یہ نوٹ لوگوں میں معاملات کی اساس بن چکے ہیں اور اب
سونے اور چاندی کے سکوں کو وہ دیکھ بھی نہیں پاتے۔ اگر ہوتے بھی ہیں تو معمولی مقدار میں
ہوتے ہیں۔ اب معاملات اور ثروت کی اساس یہی کانغذی نوٹ بن چکے ہیں۔ قانونی اداروں کے
اعتماد اور معاملات کی خوش اسلوبی سے روانی کی بنا پر یہ کانغذی نوٹ ہی اشیاء کی قیمت قرار پا چکے
ہیں۔ غرض ان کانغذی نوٹوں کو ضروریات پورا کرنے، تبادلہ کرنے اور کسب معاش و منافع میں
وہی قوت حاصل ہے جو سونے اور چاندی کی قوت ہوتی ہے اور اس لحاظ سے کانغذی نوٹ سونے
اور چاندی کی طرح افزائش پذیر اور اموال نامیہ ہیں۔" (۵)

اپنی دوسری کتاب "فوائد البنوک ہی الربا المحرم" میں لکھتے ہیں: "ان نوٹوں سے ہم خرید و
فروخت میں قیمت ادا کرتے ہیں، مزدور کو اجرت دیتے ہیں، نکاح میں مہرا د کرتے ہیں، قتل خطا
میں دیت ادا کرتے ہیں۔ اور آدمی ان نوٹوں کو چوری کر لے تو دنیا کے تمام قوانین میں اس پر
چوری کی سزا لازم آتی ہے۔ پھر آخر انہیں نقدی کیوں نہ قرار دیا جائے" (۶)

علامہ رشید رضا نے بھی اپنی کتاب "سیرالاسلام و اصول التشریح" میں کانغذی نوٹوں کو ایک
مستقل کرنسی قرار دیا ہے جس میں ربا کے تمام احکام جاری ہوتے ہیں۔ (۷) مولانا محمد تقی عثمانی
صاحب نے بھی اپنی کتاب "کانغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم" میں تفصیل کے ساتھ کرنسی نوٹوں کی
ثمنیت اور ان پر مرتب ہونے والے فقہی احکام کا جائزہ لیا ہے اور انہیں فقہی احکام کے اعتبار
سے سونے و چاندی کے مشابہہ قرار دیا ہے۔ (۸)

کرنسی نوٹوں کی ثمنیت کا اعتراف ہمیں کئی مستند معاصر کتب میں ملتا ہے۔ ڈاکٹر وجہ
الرحیلی کے مطابق شرکت و مضاربت کا رأس المال درہم و دینار یا کرنسی نوٹوں کی شکل میں ہونا
چاہئے۔ آپ لکھتے ہیں کہ "شرکت کے درست ہونے کیلئے ضروری ہے کہ اس کا سرمایہ درہم و
دینار (سونا و چاندی) یا مروج کرنسی نوٹوں کی شکل میں ہو" (۹)

۲۔ کانغذی نوٹوں کی اس حیثیت پر علماء امت کا اجماع ہو چکا ہے۔ عالم اسلام کی فقہی مجالس

اور مختلف کانفرنسوں میں اس موضوع پر متعدد قرار دادیں منظور کی جا چکی ہیں۔

اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ کے اجلاس ۱۱ - ۱۶ اکتوبر ۱۹۸۶ء میں درج ذیل قرار داد منظور کی

گئی۔

"کانغذی نوٹ فقہی اعتبار سے "نقد اعتباریہ" کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں ثمنیت مکمل طور پر موجود ہے۔ شریعت میں ربا، زکوٰۃ، سلم وغیرہ کے معاملہ میں سونے اور چاندی کے جو احکام طے شدہ ہیں، وہی احکام ان نوٹوں پر بھی جاری ہونگے" (۱۰)

اسلامی ترقیاتی بینک جدہ اور بین الاقوامی ادارہ اسلامی معاشیات اسلام آباد کے اشتراک سے جدہ میں انڈیکیشن کی شرعی حیثیت کے بارے میں ہونے والے سیمینار منعقدہ ۲۵ - ۲۸ اپریل ۱۹۸۷ء میں درج ذیل قرار داد منظور کی گئی:

"کرنسی نوٹ اس اعتبار سے سونے و چاندی کے سکوں کی جگہ ہیں کہ ان میں سود، زکوٰۃ و سلم کے احکام جاری ہوتے ہیں اور وہ مشارکت و مضاربت کا اس المال بنتے ہیں" (۱۱)

ان آراء کی روشنی میں صاحب مقالہ کا یہ اعتراض بے محل ہو جاتا ہے کہ کانغذی نوٹوں کی اپنی اصل قدر (Intrinsic Value) نہیں ہے۔ عرف میں ان نوٹوں کو کرنسی کی حیثیت حاصل ہے، تبادلہ اشیاء کے وسیلے اور انہیں ناپنے کے معیار کے طور پر لوگ انہیں قبول کرتے ہیں اور ان کی پشت پر حکومت کی ضمانت موجود ہے لہذا وہ ایک مکمل شرعی کرنسی ہیں۔

مزید برآں، سونے و چاندی کی کرنسی پر اصرار ریاست کیلئے ایک غیر ضروری زحمت کا بھی موجب ہے جبکہ شریعت کے احکام میں سہولت و آسانی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ریاست کے پاس سونے و چاندی کے اتنے وسیع ذخائر نہ ہوں کہ انہیں سکوں میں ڈھالا جائے اس کے علاوہ ریاستیں بعض اوقات قیمتی معدنیات کو بیرونی تبادلوں اور اہم ضروریات کیلئے بھی محفوظ رکھتی ہیں۔ لہذا درہم و دینار کو کرنسی بنانا کوئی شرعی تقاضا نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ایک مسئلہ حقیقت ہے کہ عرف و عادت کو شریعت میں مصدر تشریح کی حیثیت حاصل ہے، عرف میں ان نوٹوں کو ثمن کی حیثیت حاصل ہے، وہ تبادلہ اشیاء کے وسیلے، حساب کتاب کی اکائی اور اشیاء کو ناپنے کے معیار کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔ اس پس منظر میں انہیں کیوں نہ شرعی کرنسی تصور کیا جائے۔

فاضل مقالہ نگار نے زر حقیقی اور زر کاغذی کے درمیان فرق کی جو گفتگو کی ہے، وہ محض ایک نظری بحث ہے، اس کی کوئی عملی افادیت نہیں۔ اس بات سے کیا ثابت ہوتا ہے کہ "ذاتی حیثیت میں کاغذی زر سے نہ پیٹ بھرتا ہے، نہ بدن ڈھکتا ہے اور نہ یہ زیب و زینت کے کام آتا ہے۔" سوال یہ ہے کہ کیا کاغذی زر میں یہ صلاحیت نہیں کہ اس سے انسان کھانے کی اشیاء خرید کر پیٹ بھرے، کپڑا خرید کر جسم ڈھانٹے۔ زر کا ذاتی کام اگر پیٹ بھرنا اور بدن ڈھانکنا ہی ہے تو یہ کام تو درہم و دینار نے بھی سنبھالی انجام نہیں دیا۔ کرنسی نوٹوں کی طرح انہیں بھی دوسری اشیاء میں تبدیل کر کے ہی استعمال کیا جاتا تھا (رہی زیب و زینت کی بات تو یہ فریضہ تو نوٹوں کے بار خالص عرصہ سے انجام دے رہے ہیں)۔

صاحب مقالہ نے درہم و دینار اور کاغذی نوٹوں کے درمیان ایک دلچسپ فرق بیان کیا ہے، وہ یہ ہے کہ "درہم و دینار میں ثمنیت و وزن کا اعتبار کیا جاتا ہے جبکہ کاغذی نوٹوں میں ایسا نہیں۔" وہ لکھتے ہیں: "چنانچہ پچاس روپے کے ایک نوٹ کے عوض ایک روپے کے پچاس نوٹ دئے جائیں تو یہ رپوا نہیں ہوگا حالانکہ عدد اور وزن بڑھ گئے ہیں۔"

بہتر ہوتا کہ وہ یہ فرق بیان کرنے کے بعد یہ بھی بتا دیتے کہ اس گفتگو سے کیا ثابت ہوا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایک کرنسی اسی وقت شرعی اور حقیقی کھلائے گی جب اس میں ثمنیت اور وزن کا اعتبار ہوگا اور چونکہ کاغذی نوٹ ثمنیت سے محروم ہیں اور ان کا تبادلہ وزن کے ذریعہ بھی نہیں ہوتا لہذا وہ شرعی و حقیقی کرنسی نہیں۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ نقدین میں گنتی و وزن کی شرط کسی نص پر مبنی نہیں بلکہ یہ خالصتاً عرف و عادت کا معاملہ ہے۔ نص کا تقاضا صرف مماثلت و برابری کا ہے۔ یہ برابری وزن کی جانے والی اشیاء میں وزن کے ذریعہ، گنی جانے والی اشیاء میں گنتی کے ذریعہ اور ناپی جانے والی اشیاء میں ناپ کے ذریعہ مستحق ہوتی ہے۔ گویا عرف و عادت اس برابری کے پیمانے اور معیار کا تعین کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء مالکیہ و شافعیہ نے نقدین میں علت صرف ثمنیت کو قرار دیا ہے۔ وزن و گنتی کے مسئلہ کو عرف و رواج پر چھوڑ دیا ہے (۱۲) کرنسی نوٹوں میں مطلوب مماثلت و برابری کا مسئلہ بھی عرف و عادت پر ہی چھوڑا جائے گا۔ اب چونکہ عرف میں نوٹوں کے وزن و عدد کا نہیں بلکہ مقدار و قیمت کا لحاظ رکھا جاتا ہے لہذا مقدار و قیمت میں اضافہ رپوا متصور

ہوگا چاہے تبادلے میں دونوں طرف کے نوٹ وزن کے حساب سے برابر ہی کیوں نہ ہوں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ پچاس روپے کے ایک نوٹ کے بدلہ میں پچاس روپے کا ایک ہی نوٹ دے دیا جائے یا دس کے پانچ نوٹ۔ مقدار اور قیمت تو بالآخر ایک ہی رہتی ہے۔ اگر کرنسی میں وزن و عدد ہی کی مماثلت مطلوب ہے، جو صاحب مقالہ کا مدعا و مقصود معلوم ہوتی ہے، تو کیا یہ جائز ہوگا کہ دس دس روپے والے پانچ نوٹوں کا سو سو روپے والے پانچ نوٹوں سے تبادلہ کر دیا جائے؟

مقالہ نگار کا خیال ہے کہ کانڈی زر کو اس لئے زکوٰۃ اور دیگر مالی نصابات میں بطور معیار معتبر نہیں سمجھا گیا کہ اس کی قدر و قیمت تغیر و بے ثباتی کا شکار رہتی ہے۔

یہ مسئلہ کی غلط توجیہ ہے۔ اگر فقہاء نے کانڈی نوٹ کو زکوٰۃ کا معیار نہیں سمجھا تو اس کی وجہ اس کی قدر کی بے ثباتی یا عدم استحکام نہیں بلکہ یہ ہے کہ خود شارع نے سونے اور چاندی کو معیار بنایا ہے۔ کانڈی نوٹ نہ شارع۔ علیہ السلام کے دور میں موجود تھا اور نہ فقہاء مجتہدین کے دور میں کہ اس کی بے ثباتی اور ناقابل اعتبار ہونے کا معاملہ زیر بحث آتا۔ زکوٰۃ کے معیار نہ ہونے سے کس طرح یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ فقہائے امت ان نوٹوں کو بطور ثمن یا کرنسی ناقابل اعتبار سمجھتے تھے۔

صاحب مقالہ کا مذکورہ استدلال بالکل اسی طرح کا ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ فقہاء نے مسافت قصر کیلئے اونٹ کے ذریعہ سفر کو اسی لئے معیار بنایا ہے کہ جہاز اور ریل آئے دن کے حادثات کی وجہ سے ناقابل اعتبار ہو چکے ہیں۔

مقالہ نگار کی یہ بات کہ کانڈی نوٹ زر کی خصوصیات کھو چکے ہیں اور وہ اپنی قدر کی بے ثباتی کی بنیاد پر اشیاء کو ناپنے کا معیار نہیں بلکہ اشیاء ان نوٹوں کیلئے معیار بن گئی ہیں، سابقہ دلیل کی طرح اپنے اندر زیادہ وزن نہیں رکھتی۔ صحیح بات یہ ہے کہ کانڈی نوٹ ایک متعین ظاہری قیمت (Face Value) رکھتے ہیں۔ ان کی یہ متعین ظاہری قیمت اسی وقت تبدیل ہوتی ہے جب اسے جاری کرنے والی اتھارٹی خود تبدیل کر دے۔ پانچ سو کے نوٹ کو جب تک حکومت پانچ سو کا نوٹ کتی ہے اس وقت تک وہ پانچ سو کا نوٹ ہی کہلائے گا۔ اسے چار سو کا نوٹ نہیں سمجھا جاسکتا۔ افراط زر کی صورت حال میں فرق صرف اتنا پڑتا ہے کہ اس پانچ سو کے نوٹ سے اشیاء کی

نہایت کم مقدار خریدی جاسکتی ہے۔ کسی چیز کی قدر میں کسی وجہ سے اگر اضافہ ہو جائے تو اس کو خریدنے کیلئے زیادہ نوٹ درکار ہونگے جو اس کی بڑھی ہوئی قدر کو ظاہر کر رہے ہوں گے۔ اسے روپے کی قیمت میں کمی نہیں بلکہ قیمتوں میں اضافہ کہا جائے گا۔ کیونکہ روپے کی قیمت متعین ہے۔

صاحب مقالہ جس درہم و دینار (سونا و چاندی) کا مقدمہ زور و شور سے پیش کر رہے ہیں اپنے نتائج کے اعتبار سے وہ بھی تو کٹھنی نوٹوں ہی کی طرح ہیں۔ اگر سونے کے سکے - دینار کو معیار بنا لیا جائے تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس سے ہر دور میں اشیاء کی ایک ہی جیسی مقدار خریدی جاسکے گی۔ ممکن ہے ایک وقت میں اس مقدار کیلئے ایک دینار درکار ہو اور دوسرے وقت میں اسی مقدار کیلئے دو دیناروں کی ضرورت پڑے۔ بلکہ اگر اشاریہ بندی مطلوب ہی ہے تو پہلے سونے و چاندی کی اشاریہ بندی کسی معکم قیمت والی چیز سے کی جائے کیونکہ ان کی قیمتیں کئی اشیاء کے مقابلہ میں مسلسل روپہ متزل ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل کی دیت سو اونٹ مقرر کی تھی۔ سونے و چاندی میں یہی دیت بالترتیب ایک ہزار دینار اور دس ہزار درہم تھی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ سو اونٹ، دس ہزار درہم اور ایک ہزار دینار اپنی قیمت و مالیت کے اعتبار سے ایک دوسرے کے برابر تھے۔ آج کل ہمارے ملک میں دیت کی مقدار، جس کا مدار چاندی ہے، روپوں میں ایک لاکھ ستر ہزار کے قریب ہے جب کہ سو اونٹوں کی قیمت دس لاکھ سے بیس لاکھ کے درمیان ہے۔ اس طرح سو اونٹوں کے مقابلہ میں دس ہزار درہم چاندی کی قیمت محض ۱/۵ یا ۱/۱۰ رہ گئی ہے۔ جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ دونوں تقریباً برابر تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بہت سی اشیاء کے مقابلہ میں خود سونے و چاندی کی قدر بھی کم ہوتی رہتی ہے۔

جہاں تک اشیاء کی گرانی اور افراط زر کا تعلق ہے تو اس سے کسی بھی دور کی معیشت کبھی محفوظ نہیں رہی۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اشیاء معیسی ہو گئی تھیں جس پر لوگوں نے آپ سے قیمتوں کے تعین کی درخواست کی۔ لیکن آپ نے اسے قبول نہ فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان الله هو المسعر القابض الباسط و انى لا رجوا ان القى الله و ليس احد يطلبنى بمظلمة فى مال ولا د۰ (۱۳)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک فطری معاشی عمل سمجھتے تھے۔ علامہ ابن قیمؒ عمد نبوی میں واقع ہونے والی اس گرانی کو چیزوں کی قلت اور طلب کی زیادتی کا سبب قرار دیتے ہیں (۱۴) جو ایک فطری معاشی عمل ہے۔ اس سلسلہ میں اہم بات یہ ہے کہ یہ واقعہ درہم و دینار کے نظام زر میں پیش آیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ درہم و دینار قیمتوں کے استحکام کی ضمانت فراہم نہیں کر سکتے۔ بالفاظ دیگر ان سے افراط زر کو کنٹرول نہیں کیا جاسکتا۔

یہ بات بھی مسلم ہے کہ مذکورہ منگائی سے قرضو اہوں کے سرمایہ اور ان کی قوت خرید کو بھی نقصان پہنچا تھا۔ تاہم ہمیں نصوص سے کوئی ایسی دلیل نہیں ملتی کہ مقروضوں کو کہا گیا ہو کہ وہ قرضوں کی واپسی میں طے شدہ مقدار کی بجائے قدر (Value) یا قوت خرید واپس کریں۔ اگر آپ غیر مستحکم قیمتوں یا افراط زر کی حالت میں طے شدہ مقدار کی ادائیگی کو ظلم سمجھتے تو اس مسئلہ کو موجودہ دور کے "محققین" کے "اجتہاد" پر چھوڑنے کی بجائے خود ہی شارع کی حیثیت سے حل کر دیتے اور اگلی نسلوں کیلئے نہ چھوڑتے۔

کیا علت ربا ظلم ہے۔

مقالہ نگار نے مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کے حوالہ سے یہ بات لکھی ہے کہ حرمت ربا کی علت ظلم ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے لکھا ہے کہ ابن رشد نے بھی ایسی ہی بات لکھی ہے۔ ربا کے حوالے سے مقالہ نگار نے جو بات کہی ہے اس کا سارا عام طور پر وہ حلقہ لیتے ہیں جو بینک کے سود کو جائز و حلال دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ حرمت سود کی علت اگر ظلم و ناانصافی ہوتی تو پھر تو تجارتی قرضوں کا سود جائز و حلال ہونا چاہئے تھا، کیونکہ مقروض کارخانے دار بڑی آسانی سے اپنے قرضوں پر سود ادا کرتا ہے اور اسے اپنے ساتھ کوئی ظلم و ناانصافی تصور نہیں کرتا۔

ائمہ مجتہدین میں سے کسی نے بھی ظلم کو حرمت ربا کی علت نہیں قرار دیا، البتہ حکمت کے طور پر ضرور اس کا ذکر کیا ہے۔ صاحب مقالہ نے اس مقام پر علت و حکمت کو خلط ملط کر دیا ہے۔ علماء اصول نے علت کی تعریف یہ کی ہے:

"هو الوصف الظاهر المنضبط الذي يبنى عليه الحكم و ربط به وجودا و عدما"

"یہ (اصل کی) ایک ظاہر و منضبط یعنی معین و غیر متبدل صفت ہے جس پر حکم کا دار و مدار ہوتا ہے۔" (۱۵)

حکمت کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"ہی المصلحة التي قصد الشارع تحقيقها بتشريع الحكم"

یہ وہ مصلحت و مفاد ہے جو کوئی حکم وضع کرتے ہوئے شارع کے پیش نظر ہوتا ہے۔ (۱۶)
حکمت گو کہ شرعی احکام کی روح اور بنیاد ہوتی ہے مگر مخفی، غیر معین، تغیر پذیر اور ناقابل گرفت ہونے کی وجہ سے مدار احکام نہیں ہوتی۔ اسی بنا پر علماء اصول کا متفقہ فیصلہ ہے کہ:
"الاحکام ائبنا بعلمها دون حکمها۔"

"احکام کا دار و مدار علت پر ہوتا ہے کہ نہ کہ حکمتوں پر۔" (۱۷)

علت و حکمت کی اس تشریح کی روشنی میں اگر ہم ربا کی علت کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ربا الدیون میں اس کی علت اصل زر پر وہ شروط اضافہ ہے جو مدت کے مقابلہ میں مقروض سے لیا جاتا ہے۔ چنانچہ کسی بھی معاملہ قرض میں اگر شروط اضافہ پایا جائے گا تو اسے سودی معاملہ کہا جائے گا، قطع نظر اس کے کہ ظلم واقع ہوا ہے یا نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ عام طور پر اس طرح کے معاملہ میں مقروض کے ساتھ ظلم و ناانصافی واقع ہوتی ہے۔ ڈاکٹر وجہ زمیلی فرماتے ہیں کہ ربا میں علت سے مراد وہ قاعدہ ہے کہ جس سے وقوع ربا کا تعین ہوتا ہے (۱۸) (اور وہ اصل زر پر شروط اضافہ ہے)۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ہاں علت کے الفاظ فنی و اصطلاحی معنوں میں استعمال نہیں ہوئے بلکہ اپنے لغوی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں علت حکمت و مقصد کے معنوں میں وارد ہوا ہے۔

صاحب مقالہ نے اپنے موقف کی تائید میں ابن رشد کا بھی حوالہ دیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ابن رشد کی جس عبارت کا حوالہ دیا گیا ہے اسی میں کہیں بھی حرمت سود کیلئے ظلم کو علت قرار نہیں دیا گیا۔ "بداية المجتهد" کی متعلقہ عبارت یہ ہے:

"ولكن اذا توّمل الامر من طريق المعنى ظهر ((والله اعلم)) ان علتهم أولى العلق"

وذلك انه يظهر من الشرع ان المقصود بتحريم الربا انما هو لمكان الغبن الكثير الذي فيه وان العدل في المعاملات انما هو مقابلة اتساوى۔

”اگر معاملے کا اس کے مقصود کے حوالہ سے جائزہ لیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی (یعنی احناف کی) بیان کردہ علت سب سے مناسب ہے، کیونکہ تحریم ربا کی وجہ اس معاملہ میں (یعنی ہم جنس اشیاء کے اضافے کے ساتھ تبادلہ میں) دھوکہ و ناانصافی کا ہونا ہے اور معاملات میں عدل و انصاف ممکنہ حد تک برابری و مساوات سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔“ (۱۹)

یہ ساری گفتگو دراصل حرمت ربا الفضل اور ربا النسیئہ کی علت کے سیاق میں آئی ہے ابن رشد نے اموال ربویہ میں حرمت کی مختلف علتیں فقہاء کے حوالے سے نقل کی ہیں اور پھر احناف کی بیان کردہ علت ربا اتحد جنس و مقدار کو سب سے راجح قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ قصد شارع یا حکمت علم کے زیادہ قریب ہے۔

اس سے کہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے ربا میں علت ظلم کو قرار دیا ہے، بلکہ مختلف علتوں کے ذکر کے بعد یہ الفاظ کہ ”عدل مقصود شارع ہے“ اسی بات کا ثبوت ہیں کہ اتحاد جنس مقدار ان کے ہاں علت ہے اور دھوکہ و ناانصافی حکمت۔ علت و حکمت کا فرق ابن رشد جیسے مجتہد و قیاسیہ سے کیسے پوشیدہ ہو سکتا ہے۔

عددی مثلثیت اور قدر

شاہ صاحب کا خیال ہے کہ کانفی زر کی قدر کی بے ثباتی اور عدم استحکام کے پیش نظر قرضوں اور موبل ادائیگیوں میں عددی مثلثیت کا شرعی طریقہ کار نظر ثانی کا مستحق ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ”کیا موبل ادائیگیوں میں حقیقی زر کی طرح اس میں بھی بہر حال عددی مثلثیت کا لحاظ رکھا جائے گا یا ان میں حقیقی قدر ملحوظ رکھی جائے گی۔ یہ مسئلہ پیچیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ اور آج غیر سودی نظام کے اجراء کی جو کوششیں ہو رہی ہیں، ان کے ضمن میں اسی مسئلہ کا شافی حل ملت اسلامیہ کے اہل علم افراد کی ترجیحی ذمہ داری ہے۔“

شاہ صاحب جس مسئلہ پر ابتدائے مقالہ میں اہل علم کو اجتہاد کی محض دعوت دیتے نظر آتے ہیں، اسی مسئلہ پر بعد کے چند صفحات میں خود زمام اجتہاد سنبھالے ہوئے نظر آتے ہیں وہ اپنا

اجتہادی فیصلہ یوں صادر فرماتے ہیں: "اشاریہ کی اسکیم اس لئے وضع کی گئی ہے کہ اس سے اس نقصان کا ازالہ ہو سکے اور موبل ادائیگیوں میں بھی ایسے محمود کی اسلامی تعلیمات کو رو بہ عمل لایا جاسکے۔ اگر زر کاغذی کی قوت خرید میں واقع ہونے والی کمی کا ازالہ نہ کیا جائے تو یہ شرعی نصوص کی خلاف ورزی ہوگی۔" وہ مزید فرماتے ہیں: "اشاریہ کی جو اسکیم تجویز کی گئی ہے اس کی مختلف صورتوں میں اضافہ ظاہری ہے۔ اس بنا پر علت ربا (ظلم) کا اطلاق اس پر ممکن نہیں۔ بلکہ یہ حقیقت ہے کہ یہ اسکیم اصل میں ازالہ ظلم و ضرر کیلئے وضع کی گئی ہے۔"

اس موخر الذکر عبارت میں انہوں نے یہ حتمی فیصلہ سنا دیا ہے کہ قرض کی ادائیگی کرتے وقت عددی مثلیت کا لحاظ ضروری نہیں بلکہ مقروض دائن کو قرض کی قدر (Value) ادا کرے۔ اشاریہ بندی کے محاسن و مفاسد پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اموال ربویہ کے تبادلہ اور قرض کے بارے میں شرعی احکام کا جائزہ لیا جائے۔ فقہاء معاہدہ قرض کی درج ذیل تعریف کرتے ہیں:

هو ماتعطيه من مال مثلي لتقاضا^(۲۰)

"یہ وہ مال مثل ہے جو آپ کسی کو دیتے ہیں تاکہ وہ اسی سے وصول کریں"

"یہ مال مثل کسی کو مالک بنانا ہے تاکہ وہ اس کا مثل واپس کرے۔" (۲۱)

احناف کے نزدیک قرض صرف مثل اشیاء میں جاری ہوتا ہے۔ یعنی ایسی اشیاء میں جن کی اکائیاں یا افراد ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتے۔ یہ وہ اشیاء ہیں جن کی خرید و فروخت عام طور پر کیل، وزن اور گنتی کے ذریعہ ہوتی ہے۔

تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ مثل اشیاء میں ان کا مثل واپس کیا جائے گا۔ ابن قدامہ فرماتے ہیں: "قال ابن المنذر: اجمع كل من نحفظ عنه من أهل العلم على ان من اسلف سلفا مما يجوز ان يسلف فرد عليه مثله ان ذلك جائز و أن للسلف اخذ ذلك و لان المكيل والموزون يضمن في الغصب و الاتلاف بمثله فكذا ههنا۔"

"ابن منذر نے کہا: تمام اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ کسی نے دوسرے کو اگر کوئی قابل قرض چیز دی تو وہ اس کا مثل واپس کرے اور ایسا کرنا درست ہوگا اور قرض خواہ کو یہ قبول

کرنا ہوگا کیونکہ کیل و وزن والی اشیاء کے غصب و اسلاف کی صورت میں تاوان میں ان کا مثل ہی ادا کیا جاتا ہے، اسی طرح یہاں بھی ایسا ہوگا۔ (۲۲)

اسی رائے کا اظہار فقہاء شافعیہ نے بھی کیا ہے (۲۳) ابن قدامہ کی رائے میں مقدار قرض کا تعین ضروری ہے۔ اسی کا تعین تولی جانے والی اشیاء میں تول اور گنی جانے والی اشیاء میں گن کر ہوگا۔ آپ فرماتے ہیں۔ ”اگر کسی نے غیر معین وزن کے درہم و دینار ادھار لئے تو یہ ادھار درست نہ ہوگا۔ اسی طرح کوئی اور ٹاپی اور تولی جانے والی چیز اندازے سے قرض لی تو یہ درست نہ ہوگا۔ اگر درہموں کا لین دین لوگ گنتی کے ذریعہ کرتے ہیں اور اس نے بھی قرض میں گن کر درہم لئے تو اسے گن کر ہی واپس کرنے ہونگے۔ اور اگر تول کر لئے ہیں تو تول کر ہی واپس کرنے ہونگے۔“ (۲۴)

اسی طرح ابن قدامہ نے یہ وضاحت کر دی ہے کہ ادائیگی قرض میں مثلیت جہاں جنس میں ہوگی وہاں مقدار میں بھی ہوگی۔ اور مقدار کی یہ مثلیت اسی صورت میں متحقق ہوگی ہے جب وزن، کیل اور گنتی میں مماثلت اور برابری کا لحاظ رکھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء احناف نے اموال ربویہ کے تبادلہ میں جنس و مقدار کی وحدت کی شرط عائد کی ہے (۲۵) ان کا موقف یہ ہے کہ حدیث میں وارد مثلاً بمثل (۲۶) کا تقاضا اسی صورت میں پورا ہوگا جب پانچ من گندم کے بدلے میں پانچ من گندم دی جائے۔ جنبلی فقہاء کا بھی یہی موقف ہے۔ (۲۷) دیگر فقہاء کے ہاں اموال ربویہ کی علتوں میں تو اختلاف ہے کہ ان کی علت ثمنیت ہے، کھانے پینے کی اشیاء ہونا ہے، یا ذخیرہ کئے جانے کی صفت ہے، لیکن اس بات پر وہ بھی متفق ہیں ان اشیاء کے باہمی تبادلہ میں، چاہے وہ بیع ہو یا قرض، یکساں مقدار کا ضرور لحاظ رکھا جائے گا۔

فقہاء کے ہاں اس مسئلہ میں کوئی ابہام نہیں ہے کہ ”مثلیت“ سے مراد ناپ، وزن، عدد اور مقدار میں مساوات و برابری ہے۔ ان کے اقوال میں کہیں یہ اشارہ نہیں ملتا کہ اس سے مراد قیمت و قدر (value) کی برابری بھی ہو سکتی ہے۔ اس ضمن میں حدیث کے الفاظ بالکل واضح ہیں: ”الجید والردي فيد سواء“ کہ ان اشیاء کے تبادلہ میں ان کی صنعت و نوعیت کا بالکل خیال نہیں رکھا جائے گا یعنی بڑھیا و گھنیا دونوں کا تبادلہ وزن و کیل کی برابری کی بنیاد پر کیا جائے گا۔

اس حدیث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۵۰۰ روپے کے بدلے میں ۵۰۰ روپے ہی دیئے

جائیں گے چاہے واپسی قرض کے وقت ان کی صفت (Quality) بدل جائے یعنی ان کی قدر میں کمی واقع ہو جائے، کیونکہ اسی طرح "الجيد والردي في سواء" کا تقاضا پورا ہو سکتا ہے۔

مولانا تقی عثمانی فرماتے ہیں: "قرآن و سنت کے دلائل میں غور کرنے اور لوگوں کے معاملات کا مشاہدہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرض کی واپسی میں جو برابری شریعت میں مطلوب ہے وہ مقدار و کیت میں مطلوب ہے، قیمت و مالیت میں مطلوب نہیں" (۲۸)

فقہاء کا اس مسئلہ پر بھی اجماع ہے کہ اگر قرض کی واپسی کے وقت مال قرض کی قیمت میں کمی پیشی واقع ہو گئی تب بھی مقروض وہی مقدار واپس کرے گا جو اس نے قرض میں لی تھی۔ ابن قدامہ لکھتے ہیں:

"المستقرض يرد المثل في المثليات، سواء رخص سعر او غلا، او كان بحاله" مدین
مثليات میں مثل لوٹائے گا چاہے اس کی قیمت کم ہو جائے یا زیادہ یا سابقہ قیمت برقرار رہے۔" (۲۹)

ابن عابدین لکھتے ہیں:

واجتمعوا ان الفلوس اذا لم تكسد ولكن غلت قيمتها او رخصت فعليده مثل ما قبض من
العدد

"فقہاء اس بارے میں متفق ہیں کہ سکوں کی قیمت متروک ہوئے بغیر گھٹ یا بڑھ جائے تو مقروض کو وہی تعداد لوٹانی ہوگی جو اس نے قرض لی تھی" (۳۰)

عبدالرحمن الجزیری لکھتے ہیں:

"قرض کے من جملہ مسائل میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں لین دین برابر ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر پیمانے والے کوئی شے قرض دی گئی مثلاً گندم، تو یہ لازم ہوگا کہ جو شے لی ہے وہ اسی قدر واپس کی جائے، قطع نظر اس کے کہ وہ سستی ہو یا مہنگی۔ یہی حکم ان اشیاء کا ہے جن کا سودا کنتی سے یا وزن سے کیا جاتا ہے" (۳۱)

اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ بعنوان "ملکی معیشت سے سو کا خاتمہ" ۱۹۸۰ء میں بھی اسی رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔ رپورٹ کے الفاظ میں: "جہاں تک کوئی چیز ادھار دینے اور لینے کا

تعلق ہے شریعت کے مطابق نقدی کی صورت میں لین دین اور جس کی صورت میں لین دین کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ شریعت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ کسی شے کی جو مقدار ادھار لی گئی ہے وہی مقدار واپس کی جائے گی، خواہ اس عرصہ میں اس کی قیمت میں کتنا ہی تغیر واقع ہو چکا ہو۔ مثلاً اگر ایک من گندم ادھار لی گئی تو قرض دار کو گندم کی اتنی ہی مقدار واپس کرنی ہوگی خواہ اس کی قیمت تیس روپے سے بڑھ کر پچاس روپے من ہو گئی ہو یا گھٹ کر پندرہ روپے من رہ گئی ہو۔ اسی طرح اگر نقدی کی کوئی خاص مقدار قرض لی گئی ہو مثلاً ایک ہزار روپے تو قرضدار کو ایک ہزار روپیہ ہی واپس کرنا ہو گا خواہ اس عرصہ میں دوسری اجناس اور خدمات کی نسبت سے روپے کی قیمت میں کتنی ہی تبدیلی آچکی ہو" (۳۲)

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ شریعت میں احکام غلتوں کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں کیونکہ وہ واضح، معین، منضبط اور قابل گرفت ہوتی ہیں۔ کیل، وزن اور مقدار ایک معین و منضبط چیز ہے جبکہ قدر (Value) ایک مخفی، غیر معین اور تغیر پذیر چیز ہے۔ قدر چیزوں کے حوالے سے بدلتی رہتی ہے۔ ۱۰ من گندم کی قدر سونے کے حوالے سے ایک ہوگی اور نمک اور جو کے حوالے سے دوسری۔ یہ ایک اضافی (Relative) اصطلاح ہے۔ اس طرح کی مخفی، مبہم اور غیر معین صفت کو شریعت میں مدار احکام نہیں بنایا جاسکتا۔

صاحب مقالہ نے اپنے اس موقف کے حق میں کہ کانغذی نوٹوں کے باہمی تبادلہ یا قرض میں عددی ثلثیت ضروری نہیں، یہ دلیل پیش کی ہے کہ علماء نے دو مختلف ممالک کے نوٹوں کی خرید و فروخت میں تفاضل کو جائز قرار دیا ہے اگرچہ وہ دونوں شکل و صورت حجم اور نام میں یکساں ہوں۔

یہاں انہوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اس جواز کی بنیاد ان کا کانغذی نوٹ ہوتا ہے ورنہ اگر وہ درہم و دینار ہوتے تو یہ تفاضل ربوا ہوتا۔ وہ یہ حقیقت نظر انداز کر گئے ہیں کہ دو ممالک کے نوٹ ہم جنس کرنسی نہیں بلکہ دو الگ الگ کرنسیوں کی حیثیت رکھتے ہیں خواہ ان کے نام حجم اور شکل یکساں ہی کیوں نہ ہوں۔ ہم برطانوی پونڈ اور مصری پونڈ کو ایک نہیں کہہ سکتے، اسی طرح ہندوستانی اور پاکستانی روپے کو ایک جنس نہیں قرار دے سکتے۔ اب اگر یہ دو مختلف اجناس ہیں تو ان کا تفاضل کے ساتھ تبادلہ تو حدیث سے ثابت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

فاذا اختلفت هذد الاجناس فيعوا كيف شنتم اذا كان يدا بيد - (۳۳) (اگر ان اشیاء کی جنس مختلف ہو تو پھر ان کا تبادلہ جیسے چاہے کرو بشرطیکہ اس میں فوری قبضہ ہو)۔

اشاریہ بندی اور شرعی نقطہ نظر

صاحب مقالہ نے اشاریہ بندی کی توصیف میں خاصی محنت کی ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ: "اشاریہ بندی کی اسکیم حقداروں کے حق کا تحفظ کرتی ہے" "اس کا مقصد ازالہ ظلم و ضرر ہے" "یہ مقتضائے شرع کے عین مطابق ہے" "اور یہ فقہاء کے اجتہادات سے متصادم بھی نہیں ہے"۔

قرضوں کی اشاریہ بندی کا شرعی اصولوں کی روشنی میں جائزہ لینے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اشاریہ بندی کی اس اسکیم کا مختصر تعارف کرا دیا جائے جس کی طرف صاحب مقالہ نے بار بار اشارہ کیا ہے۔

ماہرن معیشت کہتے ہیں کہ کرنسی کی ایک مخصوص مقدار کی حقیقی قیمت اشیاء اور خدمات کا وہ مجموعہ ہے جو اس کرنسی سے خریدا جا سکتا ہو۔ یہ مجموعہ صارف کی اشیاء کی نوکری (Basket of Consumer's goods) کہلاتا ہے۔ اس میں روز مرہ کی اشیاء کی کوئی تیس چالیس اشیاء شامل ہوتی ہیں۔ اشاریہ کیلئے نوکری میں شامل مختلف اشیاء کی قیمتوں کے اوسط کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ اس کے لئے ان اشیاء کے علیحدہ علیحدہ خاص وزن مقرر کئے جاتے ہیں جس کی بنیاد متعلقہ چیز کی صرنی اہمیت ہوتی ہے۔ پھر ہر چیز کی قیمت میں اوسط تبدیلی کو اس کے مخصوص وزن سے ضرب دی جاتی ہے جس سے اس چیز کا اوسط وزن نکل آتا ہے۔ پھر ان تمام کا مجموعی اوسط نکالا جاتا ہے جو قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کی سطح کا اشاریہ ہوتا ہے۔ مثلاً اگر صارف کی اشیاء کی نوکری (یعنی اس میں شامل اشیاء) ۱۹۹۰ء میں سو روپے میں خریدی جا سکتی تھی اور ۱۹۹۵ء میں وہی نوکری دو سو پچاس روپے میں خریدی جا سکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کرنسی کی قوت خرید میں ۲۵% کی نسبت سے کمی واقع ہوئی ہے۔ انڈیکیشن کا طریقہ کار اور انتخاب مختلف ملکوں میں مختلف ہے، تاہم اشیاء کا قیمتوں سے ربط اشاریہ بندی کی سب سے عام ترکیب ہے۔

اس اسکیم کو اگر ہم قرضوں پر منطبق کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مقروض دائن کو راس المال کے علاوہ مزید ۲۵% بھی ادا کرے گا کیونکہ اسی طرح دائن کے سرمایہ کو پہنچنے والے خسارے کی تلافی ہو سکے گی۔ راس المال پر یہ اضافی رقم سود نہیں بلکہ دائن کے نقصان کی تلافی کھلائے گی۔ اس نقصان کا تعین قیمتوں کا اشاریہ کرتا ہے۔

شرعی نقطہ نظر سے اگر ہم قرضوں کی اشاریہ بندی کا جائزہ لیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس اسکیم میں تین طرح کی شرعی قباحتیں اور مفسد مضر ہیں:

اولاً: اس میں غرر و جهالت (اہام و غیر-یقینیت) کا عنصر موجود ہے۔ یہ "غرر" و "جہل" معاہدہ قرض میں عوض کا مبہم و غیر واضح ہونا ہے۔ قرض کو مستقبل میں خوردہ اجناس کی اوسط قیمت سے وابستہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ عقد قرض میں ایک عوض کو مجہول چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور مدین (مقروض) کو یہ علم نہیں ہے کہ اس نے معاہدہ قرض کے خاتمہ پر کیا واپس کرنا ہے۔ اس کی نظیر عقد بیع میں ثمن کا مجہول ہونا ہے۔

"حاشیہ ابن عابدین" میں آیا ہے: "ثمن کی مقدار کا تعین صحت بیع کی شرط ہے۔ اگر ثمن مجہول رہے، جیسے کوئی شخص کسی شے کی بازاری قدر کو اس کی ثمن بنا لے تو بیع باطل ہوگی"۔ (۳۳)

"فتح العزیز" میں آیا ہے: "کسی چیز کی ذمہ میں ثابت ہونے والی مقدار، چاہے وہ ثمن ہو یا بیع، اگر مجہول رہتی ہے، تو عقد باطل ہے"۔ (۳۵)

صاحب "مستحی الارادات" نے لکھا ہے: عقد معاوضہ میں عوض کا تعین اور اس کا وقت معاہدہ معلوم و معین ہونا صحت معاہدہ کی شرط ہے"۔ (۳۶)

یہ ساری نصوص ظاہر کرتی ہیں کہ عقد معاوضہ کی رو سے ایک فریق پر جس موصل عوض کی ادائیگی لازم آتی ہے، اس کا واضح اور متعین ہونا ضروری ہے۔ زیر بحث معاہدہ قرض میں مدین نے جو عوض دینا ہے، وہ وقت معاہدہ مجہول و غیر معین ہے کیونکہ اس کا تعین یعنی اس کی مقدار کا تعین اجناس کی اوسط قیمت (اشاریہ) کے ذریعہ مستقبل میں کیا جانا ہے۔

ثانیاً: یہ ربا الفضل کا پہلو لئے ہوئے ہے کیونکہ یہ شریعت کا غیر متنازع فیہ اصول ہے

کہ قابل مبادلہ شے اس کی شکل کی صورت میں واپس کی جائیگی۔ یہ مثلیت جس کے ساتھ ساتھ وزن و مقدار میں برابری کی شکل میں ہوگی۔ کانڈی نوٹ بھی، جو تمام علماء کے متفقہ فیصلہ کی رو سے درہم و دینار کے مشابہہ ہیں، اس اصول کے تابع ہوں گے۔ اور ان کا مبادلہ چاہے صرف کی صورت میں ہو یا قرض کی صورت میں، مقدار میں برابری کی بنیاد پر ہوگا۔ مقدار کی اس مثلیت سے ذرا بھی انحراف ربا الفضل کے زمرے میں آئے گا۔

اس مسئلہ پر علماء امت کے اجماع کا ایک مظہر اسلامی ترقیاتی بینک جدہ اور بین الاقوامی ادارہ برائے اسلامی اقتصادیات اسلام آباد کے زیر اہتمام ایڈ۔ کمیشن کے موضوع پر منعقدہ سیمینار ۱۹۸۷ء کی ایک قرار داد ہے جس میں کہا گیا ہے:

"ربا اور قرض کی احادیث میں مذکور یکسانیت اور مساوات سے وزن، پیمائش اور مقدار کی مساوات مراد ہے، مالیت کی برابری مراد نہیں۔ یہ بات متعلقہ احادیث سے بھی ظاہر ہے جن میں اموال ربویہ کے لین دین میں ان کی قدر (Value) کو مد نظر نہیں رکھا جاتا۔ اس نکتہ پر امت کا اجماع ہے اور اس پر اسی طرح عمل ہوتا چلا آ رہا ہے۔" (۳۷)

پاکستان میں اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت نے بھی قرضوں کی اشاریہ بندی کو خلاف شرع قرار دیا ہے۔ (۳۸)

مثلاً: یہ کسی کامل ناحق طریقہ سے کھانے کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ اس میں مقروض کے ساتھ واضح ظلم و ناانصافی تجویز کی گئی ہے۔ اسکیم میں مضر ظلم و ناانصافی اور اکل اموال الناس بالباطل کے عنصر کو درج ذیل حقائق سے واضح کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ اشاریہ بندی کی اسکیم کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ دائن کے اس نقصان کی تلافی کا طریقہ کار ہے جو اس کے سرمایہ کی قوت خرید کو عرصہ قرض کے دوران لینا ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نقصان کی ذمہ داری مقروض پر کیوں ڈالی جائے جبکہ افراط زر اس کے عمل کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہ کمی تو اس صورت میں بھی واقع ہوتی ہے جب یہ سرمایہ گھر پر رکھایا جیب میں پڑا ہوتا ہے۔

جدید معیشت میں افراط زر بہت سے عوامل کے مجموعی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے اور عملاً اس

کاتعین مشکل ہوتا ہے کہ افراط زر پیدا کرنے میں کس عامل کا کتنا حصہ ہے۔ افراط زر کا ایک بڑا روایتی سبب طلب و رسد کے درمیان عدم توازن ہے۔ رسد کے مقابلہ میں اشیاء کی طلب اگر بڑھ جائے تو افراط زر پیدا ہوتا ہے۔ اشیاء کی طلب آبادی میں اضافہ، شہروں کی طرف تیزی سے انتقال آبادی جیسے اسباب سے بڑھتی ہے۔ جبکہ دوسری طرف اشیاء کی رسد اس بڑھی ہوئی ضرورت کی تکمیل کیلئے ناکافی ہوتی ہے، چنانچہ قیمتیں بڑھتی ہیں اور افراط زر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے کیونکہ چند چیزوں کا تعاقب سرمایہ کی بڑی مقدار کر رہی ہوتی ہے۔ اسی طرح اشیاء کی پیداواری لاگت بڑھنے سے بھی افراط زر وجود میں آتا ہے۔ اشیاء کی پیداواری لاگت میں اضافہ کئی اسباب کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ خام مال اور مشینری کی قیمتوں، بجلی گیس وغیرہ کے اخراجات، ٹیکسوں مزدوروں کی تنخواہوں اور اجرتوں میں اضافہ، عام طور پر وہ اسباب ہوتے ہیں جنکی بنا پر تیار شدہ چیز کی قیمت بڑھتی ہے اور افراط زر کا سبب بنتی ہے۔ بعض اوقات حکومت کو کئی اہم قومی ضروریات کی تکمیل کیلئے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے، جبکہ اس کی آمدن اور محاصل ان اخراجات کو پورا کرنے کیلئے ناکافی ہوتے ہیں تو ایسی صورت میں اسے نئے کرنسی نوٹ چھاپنے کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ چیز افراط زر کا باعث بنتی ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بیچ در بیچ عوامل مشترکہ طور پر کسی معیشت میں افراط زر کی کیفیت کو جنم دیتے ہیں۔ اب یہ کہاں کا انصاف ہے کہ افراط زر کی وجہ سے سرمایہ کو بچھنے والے نقصان کی تلافی کا مطالبہ مدین سے کیا جائے۔ کیا یہ بینک سے قرض لینے والے کارخانہ دار کو دہری سزا دینے کے مترادف نہیں کہ ایک طرف تو وہ مزدور کی تنخواہ کو انڈکس کر کے اسے زیادہ تنخواہ ادا کرے دوسری طرف بینک کے قرض کو انڈکس کر کے اسے قرض کی بھاری رقم ادا کرے جس میں اصل زر کے علاوہ خسارے کی تلافی والی مقدار ہی شامل ہو۔

۲۔ صارف کی اشیاء کی نوکری (Basket of Consumer's Goods) سرمایہ کی قوت خرید جانچنے کا ایک ناہمضمانہ معیار ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی اقلیت کی نمائندگی کرتا ہے، بھاری اکثریت کی نمائندگی نہیں کرتا۔ اسی بات کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے ہمارے ملک کی ستر فیصد آبادی دیہات میں آباد ہے۔ ان کی اکثریت اس نوکری کی اشیاء جیسے چھوٹا گوشت، ڈبل روٹی، انڈے، نیڈولک پوڈر، نوٹھ پیسٹ وغیرہ استعمال ہی نہیں کرتی۔ ان لوگوں کی صرفی نوکری تو

بالعموم آنا، دالوں اور گھی وغیرہ سے آگے نہیں بڑھتی۔ شہروں میں بھی تمام لوگ مجوزہ نوکری کی تمام اشیاء نہیں استعمال کرتے۔ لہذا اگر قرضوں کی ادائیگی کیلئے اسے معیار بنایا گیا تو یہ بقول ڈاکٹر حسن الزمان "کچھ لوگوں کیلئے ظلم اور کچھ لوگوں کیلئے ایک ناجائز رعایت بن جائے گا" (۳۹)

اگر قرضوں کو اشیاء کی نوکری کے مطابق اندکس کیا جائے تو کئی افراد کیلئے یہ نامنصفانہ معیار ہوگا کیونکہ اس بات کا امکان ہے کہ جو اشیاء ایک فرد استعمال کر رہا ہے۔ ان کی قیمتیں حکومتی نوکری یعنی صارف کی اشیاء کی نوکری کے مقابلہ میں کم بڑھی ہوں۔ اس صورت میں اگر وہ اوسط نوکری کی قیمتوں کے مطابق قرض کی ادائیگی کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قدر کو پہنچنے والے حقیقی نقصان کے مقابلہ میں وہ زیادہ رقم ادا کر رہا ہے۔ یہ اس کے ساتھ ظلم و ناانسانی ہوگی۔

۳۔ قیمتوں کا اشاریہ قیمتوں میں تبدیلی جانچنے کا کوئی قابل اعتماد معیار نہیں۔ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ قیمتوں میں تغیر و تبدیلی فی الواقع اسی سطح پر ہوئی ہے جس کا تعین اشاریہ میں کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اشاریہ اپنی تیاری کے تمام مراحل میں اندازے اور تخمینے پر مبنی ہوتا ہے۔ ایک چیز کی قیمت بعض اوقات مختلف شہروں اور جگہوں پر مختلف ہوتی ہے۔ لیکن اشاریہ میں ایک درمیانی اوسط نکالا جاتا ہے جو یقیناً ایک اندازے ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح اشیاء کو دئے جانے والے اوزان میں بھی اندازے کام لیا جاتا ہے کیونکہ اس میں یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ فلاں چیز صارفین کیلئے دو سری کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہے۔

بعض اوقات حکومت یہ اشاریہ اپنے مخصوص مفادات کو سامنے رکھ کر بناتی ہے۔ اشاریہ میں اشیاء کے اندراج انہیں دئے جانے والے مخصوص اوزان میں اپنے مفاد کا خیال رکھتی ہے وہ اشاریہ میں ایسی چیزیں شامل کر سکتی ہے جن کی قیمتیں زیادہ نہ بڑھی ہوں تاکہ قیمتوں میں استحکام کا تاثر دیا جائے جبکہ عملاً باسٹ سے باہر کی اشیاء کی قیمتیں بڑھ رہی ہوگی۔ اس طرح اشاریہ سرمایہ کی حقیقی قدر جانچنے کا ایک ناقابل اعتبار معیار ہوگا۔ ایسے ناقابل اعتبار اور غیر منصفانہ پیمانے سے قرضوں کی ادائیگی کس طرح منصفانہ اور مقتضائے شرع کے مطابق ہو سکتی ہے۔

۴۔ اشاریہ بندی نامنصفانہ ہونے کے ساتھ ساتھ غیر عملی بھی ہے اشاریہ کسی خاص تاریخ کو قیمتوں کی بنیاد پر یا کسی خاص مدت کے دوران اوسط قیمت کی بنیاد پر سال بھر میں ایک بار،

دوبارہ یا تین بار بنایا جاتا ہے جبکہ اس کے برعکس بچت، ادھار اور ان کی ادائیگی روزمرہ کا کام ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس عرصہ میں کوئی اشاریہ موجود نہ ہو اس میں قرض کی ادائیگی کس طرح کی جائے گی۔ کیا یہ اندازے سے ہوگی یا پچھلے اشاریہ کی بنیاد پر۔

انڈیا - کمیشن کی یہی قباحتیں ہیں جن کی بنا پر علماء اور مسلم ماہرین معیشت نے بالاتفاق قرضوں کی اشاریہ بندی کو ناجائز اور خلاف شرع قرار دیا ہے۔ (۴۰)

فلوس میں امام ابو یوسف کی رائے۔

صاحب مقالہ فرماتے ہیں کہ امام ابو یوسف "کے نزدیک فلوس کے "رخص و غلاء" (ارزانی و مہنگائی) کی صورت میں مقروض دائن کو فلوس کی قدر (Value) ادا کرنے کا پابند ہے یعنی وہ اسے فلوس کی وہ قیمت ادا کرے جو قرض کے قبضے کے وقت تھی۔ اس سے انہوں نے یہ نتیجہ برآمد کیا ہے کہ احتلاف کے ہاں زر کی قدر وقتی کو تسلیم کیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ "رخص و غلاء" کے حالات میں قیمت (Value) کی ادائیگی ہی قرین عدل و انصاف ہے۔

فلوس کی قیمت میں اتار چڑھاؤ اور اس کے موجد ادائیگیوں پر اثرات کے حوالہ سے امام ابو یوسف کے اصل موقف کا جائزہ لینے سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ فقہاء کے ہاں فلوس کی بطور ثمن یا کرنسی حیثیت کیا ہے تاکہ کاغذی نوٹوں کو ان پر قیاس کیا جاسکے۔

عربی میں فلوس ایک بڑے سکے کی ریزگاری (Petty Coins) یا چھوٹے چھوٹے اجزاء کو کہا جاتا ہے جیسے روپے کے پیسے۔ عربی میں "افلس الرجل" (آدمی مفلس ہو گیا) کے معنی یہ ہوتے ہیں۔ کہ بڑے بڑے نوٹوں کا مالک اب چھوٹے چھوٹے پیسوں والا ہو گیا ہے۔ یعنی دہری اور دھیلے کی سطح پر آ گیا ہے۔ "مخار الصحاح" میں آیا ہے۔ "افلس الرجل مفلسا کائنات صارت دراهم فلوسا" "آدمی مفلس ہو گیا گویا اس کے دراہم فلوس میں تبدیل ہو گئے" (۴۱)۔ امام شوکانی فرماتے ہیں:

"المفلس شرعاً من یزید دینہ علی موجودہ مسمى مفلسا لانه صار ذا فلوس بعد ان کان ذا دراهم"۔

"شرعی اصطلاح میں مفلس وہ ہے جس کے قرضے اس کے پاس موجود مال سے زیادہ

ہوں۔ اسے مفلس اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ اب وہ پیسوں پر آ گیا ہے جبکہ پہلے وہ درہموں (روپوں) کا مالک تھا۔" (۳۲)

زمانہ قدیم میں فلوس اپنی اس بے وقعتی کے علاوہ قانونی زر ہونے کی صفت سے بھی محروم تھے۔ ان کی پشت پر کوئی قانونی ضمانت نہیں تھی۔ ان کی کوئی متعین قیمت بھی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ ان کے وزن میں یکسانیت بھی مفقود تھی۔ فلوس کا وزن ہر علاقہ میں علیحدہ علیحدہ تھا ڈاکٹر حسن الزمان کی تحقیق کے مطابق یہ وزن عام طور پر چھ سے تیس گرام کے درمیان ہوتا تھا۔ بعض اوقات ایک صوبے کی مختلف شہروں میں الگ الگ وزن کے فلوس چلتے تھے۔

یوڈووج نے اپنی کتاب "Partnership and Profit in Medieval Islam" میں تفصیل کے ساتھ ان اسباب کا جائزہ لیا ہے جن کی بنا پر فقہاء کے ہاں فلوس کی حیثیت بطور شمن متنازع تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ "فلوس محض علامتی سکے تھے۔ وہ درہم و دینار کی طرح کبھی بھی قانونی زر نہیں رہے۔ ان کی قیمت اور قبولیت ہر جگہ دوسری سے مختلف تھی۔ درہم و دینار کے برعکس ان کی ڈھلائی بہت مقامی سطحوں پر ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وزن، شکل اور حجم میں ان کے درمیان بہت بڑا تفاوت تھا۔" (۳۳)

انہی حقائق کی بنا پر فقہاء کے ہاں فلوس کی ثمنیت کبھی مسلم نہیں رہی۔ اس کی ایک بڑی دلیل فلوس کو مشارکت و مضاربت کا راس المال بنانے میں ان کا اختلاف ہے۔ امام محمدؒ کے علاوہ باقی تمام فقہاء کے نزدیک فلوس مشارکت و مضاربت کا راس المال نہیں بن سکتے۔ حتیٰ کہ امام ابو یوسف بھی اسے راس المال کے طور پر قبول نہیں کرتے۔ امام شافعی کے نزدیک فلوس شمن نہیں خواہ وہ رائج ہی کیوں نہ ہوں۔ (۳۴)

عرف و عادت اور فقہی نصوص سے ملنے والے ان شواہد سے فلوس کی جو صورت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ یا تو اصلاً کرنسی ہے ہی نہیں یا ایک ناقص کرنسی ہے۔ اس پس منظر میں کانڈی نوٹوں کو فلوس پر قیاس کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ کانڈی نوٹوں کی تو ایک واضح و متعین قیمت ہوتی ہے، ان کی پشت پر حکومت کی ضمانت بھی ہوتی ہے۔ وہ ملک کے ہر علاقے میں یکساں شمن کے طور پر جاری و ساری ہوتے ہیں۔ کانڈی نوٹ علماء امت کے متعدد فیصلوں کی رو سے درہم و دینار کی مانند ہیں۔ لہذا انہیں اگر کسی کرنسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے تو وہ درہم و دینار ہیں

نہ کہ فلوس۔

اب ہم فلوس کے بارے میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ کے مسلک کی طرف آتے ہیں۔ امام ابو یوسف کا موقف یہ ہے کہ اگر فلوس کا مارکیٹ میں چلن موقوف ہو جائے تو ایسی صورت میں مشتری یا مدین ان کی بازاری قدر (Market Value) ادا کرے گا۔ لیکن اگر ان کا رواج تو ختم نہ ہو بلکہ صرف قیمت میں کمی بیشی واقع ہو جائے تو ایسی صورت میں وہ اتنے ہی فلوس واپس کرے گا جو اس نے قرض لئے تھے۔ گویا فلوس کی قیمت میں کمی یا ان کی ارزانی کی صورت میں واجب الادا رقم کے بارے میں وہ جمہور کے موقف سے مکمل طور پر متفق ہیں۔ اس کی تصدیق امام کاسانی یوں کرتے ہیں۔ "ولو لم تکسد و لکنھا رخصت قیمتها او غلت لا ینفسخ البیع بالاجماع و علی المشتري ان ینقد مثلھا عددا و لا یتلف الی القيمة هنا لان الرخص او الغلاء لا یوجب بطلان الثمنیة الا ترى ان الدرہم قد ترخص و قد تغلور وھی علی حالھا الثمان۔"

اگر فلوس کا مارکیٹ میں رواج ختم ہوئے بغیر ان کی قیمت میں کمی یا زیادتی واقع ہو جائے تو ایسی صورت میں بالاتفاق بیع فسخ نہیں ہوگی اور مشتری کو (طے شدہ) فلوس گن کر دینے ہونگے اور قیمت و قدر (Value) کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا کیونکہ ارزانی و گرانی ثمنیت کو ختم نہیں کرتی۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ درہم کبھی ارزاں ہوتے ہیں کبھی گراں۔ لیکن اس کے باوجود وہ ثمن رہتے ہیں۔ (۳۵)

معلوم نہیں صاحب مقالہ نے یہ نتیجہ کہاں سے اخذ کیا ہے کہ "امام ابو یوسف کا نقطہ نظر یہ ہے کہ موصل مالی معاہدوں میں فلوس کے "رخص و غلاء" کا اعتبار ہوگا۔ چنانچہ اگر معاملہ قرض کا ہے تو قبضہ کے وقت کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ اور اگر خرید و فروخت کا معاملہ ہو تو معاہدے کے وقت کی قیمت معتبر سمجھی جائے گی۔"

امرواقع یہ ہے کہ جس واحد صورت میں امام ابو یوسف "وامام محمد" قدر کی ادائیگی کی اجازت دیتے ہیں وہ فلوس کے انتفاع یا رواج میں نہ رہنے کی صورت ہے۔ کیونکہ ایسی صورت میں مثل کی ادائیگی ممکن نہیں ہوتی۔ لہذا مذکورہ دونوں فقہاء کے نزدیک قیمت (Value) ادا کی جائیگی۔ اب سوال یہ ہے کہ کس تاریخ سے قیمت کا تعین کیا جائے گا؟ اس کے جواب میں امام ابو یوسف یہ کہتے ہیں کہ اس کا تعین معاہدہ کے دن ان کی قیمت سے کیا جائے گا جبکہ امام محمد کے

نزدیک جس دن فلوس کا رواج ختم ہوا ہے، اس دن ان کی قیمت سے واجب الادا قدر (Value) کا تعین ہوگا۔

خود صاحب مقالہ کے ہاں بھی ہمارے اس موقف کی تائید ملتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ: "امام ابو یوسف کے نزدیک اس نقطہ نظر کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ فلوس کی ٹھنی حیثیت محض لوگوں میں ان کی رواج پذیری کے باعث ہی ہوتی ہے۔ اب اگر لوگوں کا رواج ہی بدل جائے (یعنی لوگ انہیں ٹمن کے طور پر استعمال کرنا چھوڑ دیں) یا ان کے رواج کی کیفیت میں تبدیلی آجائے تو اصولاً اس تغیر کی رعایت کرنی چاہئے۔"

لیکن اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ فلوس کی گرانی و ارزانی کے سلسلہ میں امام ابو یوسف کا نقطہ نظر وہی ہے جو صاحب مقالہ نے نقل کیا ہے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ "احناف کے ہاں زر کی قدر وقتی کو تسلیم کیا گیا ہے اور فقہ حنفی کی رو سے عقد (یا قبضہ) اور ادائیگی کے مابین وقت میں قیمتوں کے اختلاف کا لحاظ ضروری ہے۔" یہ صاحب مقالہ کی اپنے رائے یا خواہش تو ہو سکتی ہے لیکن فقہ حنفی کا فیصلہ نہیں ہے۔ فقہ حنفی کا فیصلہ تو وہ ہے جو ابن عابدین نے نقل کیا ہے کہ: "تمام حنفی فقہاء اس پر متفق ہیں کہ اگر فلوس کے رواج میں رہتے ہوئے ان کی قیمت بڑھ یا گھٹ جائے تو مدین نقد کی اتنی ہی مقدار واپس کرے گا جو اس نے لی تھی" (۴۶)

ابن عابدین کی مذکورہ عبارت میں "اجماع و اتفاق" کے الفاظ اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ فلوس کے سلسلہ میں مفتی بہ مسلک وہ نہیں جو صاحب مقالہ نے نقل کیا ہے بلکہ وہ ہے جو ابن عابدین نے بیان کیا ہے۔

اسی موقف کا اظہار الشیخ عبدالقادر محمد حسب اللہ الحسینی الحنفی نے بھی اپنے رسالہ "تراجع سعر النقود بالامر السلطانی" (سرکاری حکم سے نقد کی قیمت میں کمی) میں کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"قد تكرر في زماننا ورود الامر السلطاني بتنقيص سعر بعض النقود الراجحة، فاذا كان عقد البيع او القرض وقع على نوع معين منها كالريال الفرنجى مثلا فلا شبهة في ان الواجب دفع مثل ماوقع عليه البيع او القرض"

ہمارے عہد میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ سرکاری حکم سے بعض مروج سکوں کی قیمت کم کر

دی جاتی ہے اگر اس طرح کسی خاص سکہ جیسے فرنجی ریال کی قیمت میں کمی واقع ہوئی ہو اور دو افراد نے اس خاص سکہ کی بنیاد پر بیع یا قرض کا معاہدہ کر رکھا ہو تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اتنے ہی سکے واپس کرے گا جتنے بیع یا قرض میں ملے ہوئے تھے (یعنی ان کی قدر و قیمت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جائے گا) (۴۷)

یہی موقف دیگر فقہاء کا بھی ہے جو گزشتہ صفحات میں نقل کر دیا گیا ہے۔

قرض کے حوالے سے آخری بات جس کا ذکر کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اسلام میں شخصی ضرورت کیلئے کسی کو قرض دینا اور کسی حاجت مند کی حاجت پورا کرنا ایک عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ انسانیت کی خدمت ہے جس کی ترغیب اسلامی تعلیمات میں جا بجا ملتی ہے۔ قرض انسان کی ایک معاشرتی و اخلاقی ذمہ داری بھی ہے یہ بنیادی طور پر ایک غیر مادی فعل ہے اور ایثار و قربانی کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ یہ اجر و ثواب کی نیت اور ضرورت مند کی ضرورت کی تکمیل کے مقصد سے دیا جاتا ہے، اسے مادی پیمانوں سے ناپنا مقضائے شرع نہیں۔ قرض میں قدر یا قوت خرید جیسے مطالبات اس کی اصل روح کے منافی ہیں۔

قرض کو اگر خالص مادی پیمانے سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرض دینے والا قدر اور قوت خرید میں کمی کا نقصان ہی نہیں برداشت کرتا بلکہ اس کے علاوہ بھی اسے کئی دیگر نقصان اٹھانا پڑتے ہیں۔ وہ ایک خاص عرصہ کیلئے اپنے اس سرمایہ سے محروم ہو جاتا ہے جسے وہ کسی منفعت بخش کام میں لگا سکتا تھا۔ قرض کو وصول کرنے کیلئے اسے زحمت الگ سے اٹھانا پڑتی ہے۔ مقروض تک پہنچنے کیلئے اخراجات آمدورفت ایک الگ مالی نقصان ہیں۔ بعض اوقات عسرت و تنگدستی کی بنا پر مقروض وقت مقررہ پر قرض ادا نہیں کر سکتا۔ ایسی صورت میں قرضخواہ کو مزید انتظار کی زحمت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ لیکن ان تمام مادی و غیر مادی نقصانات کے باوجود اسلام نے قرض دینے کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اور اجر و فضیلت کے اعتبار سے اسے صدقہ سے بڑا عمل قرار دیا ہے کیونکہ یہ کسی انسان کی مشکل میں مدد کرنا ہے لہذا اسلامی تعلیمات کی رو سے اگر کسی نے شخصی ضرورت کیلئے کسی کو قرض دینا ہے تو وہ خالصتاً اجر و ثواب اور مدد و تعاون کے نقطہ نظر سے دے۔

جہاں تک تجارتی مقاصد کیلئے قرض کی فراہمی کا تعلق ہے تو اس کے لئے شریعت نے

قرض کی بجائے مشارکت و مضاربت کے طریقہ ہائے کاروبار تجویز کئے ہیں۔ مشارکت و مضاربت کاروبار کے نتیجہ میں ایک فرد نہ صرف اپنے سرمایہ کی قدر محفوظ کر سکتا ہے بلکہ اپنے سرمایہ پر مزید اسے نفع بھی مل سکتا ہے۔

امید ہے ان حقائق کی روشنی میں فاضل مقالہ نگار اشادیہ بندی سے متعلق اپنے موقف پر نظر ثانی فرمائیں گے۔

حواشی و حوالہ جات

- ۱- بلاذری: ابو الحسنین، احمد بن یحییٰ بن جابر البلاذری، فتوح البلدان، ترجمہ: مولوی سید ابو الخیر المودودی، نیس اکیڈمی، کراچی، د. ت. جلد ۲ ص ۲۲۳۔
- ۲- مالک بن انس، المدونة الکبریٰ (روایۃ سحنون) دار صادر، بیروت، د. ت. جلد ۸ ص ۳۹۵-۳۹۶۔
- ۳- مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ، صحیح و ترتیب: عبدالرحمن بن محمد بن قاسم، مطابع ریاض و دار العربیہ - بیروت ۱۳۹۸ھ، جلد ۲۹ ص ۳۷۱-۳۷۲۔
- ۴- فتویٰ ادارات البحوث الطیبیہ والافتاء والدعویہ ۱۷ رجب الثانی ۱۳۹۳ھ، مطبوعہ: البورق النجدی، از الشیخ عبداللہ بن سلیمان بن منیع، ریاض، اشاعت دوم، ۱۳۹۳ھ / ۱۹۸۳ء ص ۱۳۳۔
- ۵- القرضاوی: یوسف القرضاوی، فہمہ الزکوٰۃ (اردو ترجمہ)، البدر پبلیکیشنز، لاہور و ادارہ معارف اسلامی، ۱۹۸۲ء، جلد ۲ ص ۵۱۔
- ۶- القرضاوی: فوائد البنوك ہی الربا المحرم، اردو ترجمہ بعنوان "ربوا اور بینک کا سود" از جناب عتیق النفر انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء، ص ۳۰ (اردو ترجمہ)۔
- ۷- علامہ رشید رضا: ہمسر الاسلام و اصول الفقہ، مطبعہ النور، مصر، د. ت. ص ۶۱۔
- ۸- تقی عثمانی: مولانا تقی عثمانی، کلمہ ذی فہم اور کرنسی کا حکم، مبین اسلامک پبلشرز، کراچی، ص ۲۷۔
- ۹- الزحلی: ذاکٹر وجہ الزحلی، الفقہ الاسلامی فی اسلوبہ الجدید، مطابع جامعہ دمشق، د. ت. جلد ۱ ص ۶۱۸۔
- ۱۰- اسلامی فقہ اکیڈمی، قرار دہیں اور سفارشات (۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۴ء)، اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ، ص ۵۲۔

- ۱۱- اسلامی ترقیاتی بینک جدہ اور بین الاقوامی ادارہ اسلامی معاشیات کے زیر اہتمام سینار بعنوان
 ۱۰- کمیٹیشن اور اسلامی معیشت پر اس کے اثرات۔ منقذہ ۲۵-۲۸ اپریل ۱۹۸۷ء کی سفارشات،
 سفارش نمبر ۲ (غیر مطبوعہ)۔
- ۱۲- (۱) خرمی: محمد الخرمی، شرح مختصر التخلیل مع حاشیہ الشیخ الحدادی، المطبعہ الامیریہ الکبریٰ، بولاق، اشاعت
 دوم، ۱۳۱۷ھ، جلد ۵ ص ۵۶۔
- (ii) النووی: محی الدین بن شرف النووی، المجموع شرح المہذب، ناشر: زکریا علی یوسف، القاہرہ، د.
 ت، جلد ۹ ص ۲۳۷۔
- ۱۳- شوکانی: محمد بن علی بن محمد الشوکانی، نیل الاوطار، انصار السنۃ الحمدیہ لاہور، د. ت، جلد ۵، ص ۲۳۳۔
- ۱۴- ابن قیم الجوزیہ، الطرق الحکمیہ، تحقیق: د. محمد جمیل غازی، مطبعہ الدینی، ۱۹۷۷ء، ص ۳۷۳۔
 ۳۷۳۔
- ۱۵- (۱) الزحلی: ڈاکٹر وجہ الزحلی، اصول الفقہ الاسلامی، دار الفکر، دمشق، اشاعت اول، ۱۳۰۶ھ / ۱۹۸۶ء جلد
 ۱ ص ۶۳۸۔
- (ii) زیدان: ڈاکٹر عبدالکریم زیدان، الوجیز فی اصول الفقہ، دار الکتب الاسلامیہ، لاہور، د. ت، ص
 ۳۰۳۔
- ۱۶- الزحلی، حوالہ سابق، جلد ۱ ص ۶۳۹۔
- ۱۷- زیدان، حوالہ سابق ص ۳۰۳۔
- ۱۸- الزحلی، الفقہ الاسلامی وادلتہ، دار الفکر، دمشق، جلد ۳ ص ۶۷۶۔
- ۱۹- ابن رشد: ابو الولید محمد بن احمد بن احمد ابن رشد، بدایۃ المجتہد، مکتبہ علیہ لاہور، اشاعت دوم، جنوری
 ۱۹۸۳ء، جلد ۲ ص ۹۹۔
- ۲۰- ابن عبدین، رد المحتار، ناشر: ایچ۔ ایم۔ سعید کمپنی، د. ت، جلد ۵، ص ۱۶۱۔
- ۲۱- الجزیری: عبدالرحمن الجزیری، کتاب الفقہ علی المذہب الادبۃ، دار احیاء التراث العربی، بیروت،
 اشاعت ششم، جلد ۳ ص ۳۳۸۔
- ۲۲- ابن قدامہ، عبداللہ بن احمد بن قدامہ، المغنی، دار الفکر، مسقط، نمبر ۳۳۶، جلد ۲ ص ۱۱۹۔
- ۲۳- خطیب: محمد الشربینی الخلیب، مفتی المحتاج، المکتبہ التجاریہ الکبریٰ، مصر، د. ت، جلد ۲، ص ۱۱۹۔
- ۲۴- ابن قدامہ، حوالہ سابق، مسقط، نمبر ۳۳۶، جلد ۳ ص ۲۱۰۔

- ۲۵- کاسانی: علاء الدین ابوبکر بن مسعود الکاسانی، بدائع الصنائع، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ، اشاعت اول ۱۳۲۸ء
۱۹۱۰ء، جلد ۳ ص ۱۸۳-۱۸۵
- ۲۶- حدیث کے الفاظ یہ ہیں: "الذهب بالذهب والفضة بالبر والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً
بمثل ید اید"۔ نیل الاوطار للشوکانی، ناشر: انصار السنۃ الحمدیہ، لاہور، دت جلد ۵ ص ۲۰۲۔
- ۲۷- ابن قدامہ، حوالہ سابق جلد ۳ ص ۲۱۰
- ۲۸- مولانا تقی عثمانی، حوالہ سابق، ص ۵۱
- ۲۹- ابن قدامہ، حوالہ سابق، مسئلہ نمبر ۳۲۶۹، جلد ۳ ص ۲۱۳۔
- ۳۰- ابن عابدین، رسائل ابن عابدین، رسالت تنبیہ الرقود فی مسائل التقود، سہیل اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۰ء،
جلد ۲ ص ۶۳
- ۳۱- عبدالرحمن الجزیری، کتاب الفقہ علی المذاهب الاربعہ، دار احیاء التراث العربی، بیروت جلد ۳،
ص ۳۳۸۔
- ۳۲- رپورٹ اسلامی نظریاتی کونسل بعنوان "ملکی معیشت سے سود کا خاتمہ" ۱۹۸۰ء، المرکز العالمی للابحاث
الاقتصاد الاسلامی، اپریل ۱۹۸۲ء آر نیکل (۱-۱۰) ص ۲۹۔ (عربی ترجمہ)
- ۳۳- نیل الاوطار، حوالہ سابق جلد ۵، ص ۲۰۳۔
- ۳۴- ابن عابدین، رد المحتار، جلد ۵، ص ۶۰۔
- ۳۵- رافعی: عبدالکریم بن محمد الرافعی، فتح العزیز شرح الوجیز، مطبعۃ التضامن الاخوانی، دت جلد ۸ ص ۱۳۹۔
- ۳۶- ابن بخار: تقی الدین محمد بن احمد الفتوی، مسمی الارادات، تحقیق: عبدالغنی، عالم الکتب، دت جلد ۱،
ص ۳۳۵۔
- ۳۷- مجموعہ سفارشات سیمینار بابت "انڈیکیشن اور اسلامی معیشت پر اس کے اثرات" زیر اہتمام اسلامی
ترقیاتی بینک جدہ اور بین الاقوامی ادارہ اسلامی اقتصادیات، منعقدہ ۲۵ تا ۲۸ اپریل ۱۹۸۷ء،
(غیر مطبوعہ)
- ۳۸- رپورٹ اسلامی نظریاتی کونسل ۱۹۸۰ء بابت "ملکی معیشت سے سود کا خاتمہ"، آر نیکل نمبر ۱۰ (۱۰) اور وفاقی
شریعت کا سود سے متعلق فیصلہ، (شریعت کمیشن نمبر ۳۰ / آئی / ۱۹۹۰ء بابت قانون سود ۱۸۳۹ء)۔
آر نیکل نمبر ۱۶۳ تا ۲۰۱۔
- ۳۹- ڈاکٹر حسن زمان، 'Indexation of Financial Assets'، ناشر: المعهد العالمی للتفکر الاسلامی،
اسلام آباد، ص ۴۴۔

- ۳۰- دیکھئے: (i) ڈاکٹر عمر چھاہرا، "Towards a Just Monetary System" اسلامک فاؤنڈیشن
لیسٹر، برطانیہ، ۱۹۸۵ء، ص ۳۹-۳۰:
- (ii) ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، "Issues in Islamic Banking" اسلامک فاؤنڈیشن، لیسٹر،
برطانیہ، ۱۹۸۳ء، ص ۳۱-۳۲
- (iii) ڈاکٹر حسن زمان، "Indexation of Financial Assets" صفحات ۳۸ تا ۵۰۔
- (iv) مولانا تقی عثمانی، کانڈی نوٹ اور کرنسی کا حکم، مرجع سابق۔ صفحات ۳۵ تا ۸۵
- (v) مولانا گوہر رحمن، تقسیم المسائل، جامعہ اسلامیہ تقسیم القرآن، مردان، فروری ۱۹۹۳ء
ص ۳۱۳-۳۱۶۔
- (vi) ڈاکٹر محمود غازی، "Indexation and Inflation" پاکستان بینکر میں شائع شدہ مقالہ جنوری
۱۹۹۳ء۔
- (vii) ایس۔ این۔ ایچ نقوی، Ethics and Economics، اسلامک فاؤنڈیشن، ستمبر ۱۹۸۱ء ص
۱۲۱-۱۲۲۔
- ۳۱- محمد بن ابی بکر بن عبد القادر، مختار الصحاح، موسیٰ علوم القرآن، بیروت، دت، ص ۵۱۰-۵۱۱
- ۳۲- نیل الاوطار، مرجع سابق، جلد ۵ ص ۲۵۵۔
- ۳۳- ابراہیم یوزووج، Partnership and Profit in Medieval Islam، پرنس یونیورسٹی پریس،
نویجرسی، ۱۹۷۰ء ص ۵۲۔
- ۳۴- ربلی: شمس الدین محمد بن احمد الربلی، ضایۃ المحتاج الی شرح المحتاج، المطبعۃ البیتۃ العربیہ، ۱۳۰۴ھ،
جلد ۳ ص ۳۳۳۔
- ۳۵- بدائع الصنائع، مرجع سابق، جلد ۵ ص ۲۳۲۔
- ۳۶- مجموعہ رسائل ابن عابدین، رسالہ تنبیہ الرقود فی مسائل النقود، سہیل اکیڈمی لاہور اشاعت دوم،
۱۳۰۰ھ / ۱۹۸۰ء جلد ۲ ص ۶۲۔
- ۳۷- الشیخ عبد القادر محمد حسب اللہ الحسینی الحنفی، تراجم معر النقود بالامر السلطانی، تحقیق: نزیر حماد مجلہبحاث
الاقتصاد الاسلامی، العدد الثانی، المجلد الثانی، ۱۳۰۵ھ / ۱۹۸۵ء۔